اردو ترجمۂ قرآن پر آیات کے کلامی پہلوؤں کے لحاظ کا اثر

حافظ محمد طاہر المصطفیٰ*
محمد شاہد حبیب **

Abstract

The Quran is the basic source of eternal orders of Allah Almighty. So, it has been the responsibility of all scholars in every era to perform their duty for translation and interpretation of The Holy Quran. The work in Urdu translation of The Holy Quran has been started in1776 in Indo-Pak Sub continent. The translators had different tastes, sects and belief (Kalami) tendencies and this is a natural need, from which we can't keep ourselves away. The effect of these belief (Kalami) tendencies of translators can be observed in the translations of The Holy Quran which has the both positive and negative effects on the meanings of The Holy Quran .The comparative and descriptive research methodology will be applied in it to achieve objectives of the research.

***KEYWORDS**: The Quran, Urdu Translations of Quranic Verses, Belief (Kalam) Tendencies, effects of Meanings of Urdu Quranic Translations.*

تعارف

قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کے ابدی احکامات کا مآخذ ہے، ہر دور میں پیش آمدہ مسائل کا حل اس کتاب مبین میں موجود ہے۔ یہی وہ قرآنی اعجاز ہے جس سے دوسری کتب محروم ہیں۔ اس لیے ہر دور کے علما پر یہ ذمے داری عائد رہی کہ وہ اس کتاب کے ترجمہ و تفسیر کا کام سرانجام دیں تاکہ بندگانِ خدا قرآن کی تعلیمات سے بہرہ ور ہو سکیں۔ قرآن کریم

* حافظ محمد طاہر المصطفیٰ، لیکچرار، یونی ورسٹی آف لاہور، پاکپتن کیمپس۔
** ڈاکٹر محمد شاہد حبیب، اسسٹنٹ پروفیسر، خواجہ فرید یونی ورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ انفارمیشن ٹیکنالوجی، رحیم یار خان۔

کے الفاظ و آیات میں اس قدر جامعیت اور وسعت ہے کہ ان کی مفصل تفسیر و تشریح تو کی جاسکتی ہے مگر کسی بھی زبان میں نہ تو اس کے ترجمہ کا حق ادا کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کے معانی و مفاہیم کا ہمہ جہت اور مکمل احاطہ ممکن ہے۔ اردو زبان میں تراجم و تفسیر قرآن کا سلسلہ سولھویں صدی عیسوی کی آخری دہائی یا دسویں صدی ہجری کے آغاز سے شروع ہوا لیکن یہ سلسلہ چند سپاروں اور سورتوں تک محدود رہا۔ اردو زبان میں قرآن کریم کا مکمل ترجمہ جو سب سے پہلے ۱۸۲۹ء/ ۱۲۴۵ھ میں چھپ کر منظر عام پر آیا وہ شاہ عبدالقادر دہلوی کا ترجمہ قرآن مع مختصر تشریح موضح قرآن ہے[1] اس کی اشاعت سے لے کر اب ۲۰۱۸ء تک سینکڑوں تراجم منظر عام پر آچکے ہیں۔ دیگر فنون کی طرح تدریجی ترقی کے بعد ترجمہ بھی علمی دنیا میں ایک ادبی صنف، تخلیقی عمل اور فن کے طور پر رونما ہوا۔ اس طرح اس کے متعدد اصول وضوابط، اقسام، شرائط اور نظریات سامنے آئے۔

ترجمۂ قرآن کے اسالیب

ترجمۂ قرآن کے جواز اور عدم جواز کی مختصر بحث کے بعد جواز پر اتفاق ہو گیا تو مترجمین قرآن نے مختلف اسالیب کے تحت تراجم کیے ذیل میں دو کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

لفظی ترجمہ

اس اسلوبِ ترجمہ میں قرآن کے الفاظ کی جگہ دوسری زبان کے الفاظ لانے کی کوشش کی گئی۔ چاہے اس کلام کا ربط اور محاوراتی حسن برقرار نہ رہے۔ اس میں کلام کی ترکیب اور جملہ کی ساخت کا خیال رکھا جاتا ہے اگرچہ ترسیل معنی میں کتنا ہی خلل کیوں نہ واقع ہو۔

توضیحی ترجمہ

اس اسلوب میں قرآن کی آیت کو پڑھنے سے جو مفہوم مترجم کے ذہن میں آتا ہے وہ اسے اپنی زبان میں بیان کر دیتا ہے۔ اس میں ترسیل معنی کو اہمیت دی جاتی ہے۔ اس مقصد کے لیے مترجم قوسین کے استعمال کے ذریعے اور بعض اوقات قوسین کے استعمال کے بغیر اپنی طرف سے بھی الفاظ کا اضافہ کر دیتا ہے۔

صحیح ترجمے کی بنیادی شرائط

اہل علم نے ترجمۂ قرآن کے لیے چند شرائط لازم قرار دی ہیں۔ ان میں سے کچھ شرائط کا تعلق عملِ ترجمہ یا ترجمہ شدہ مواد سے ہے اور کچھ مترجم کی ذات سے تعلق رکھتی ہے۔ جو شرائط مترجم کی ذات سے متعلق ہیں ان میں سے دو کا تذکرہ ڈاکٹر محمد حسین ذہبی نے ان الفاظ میں کیا ہے:

۱۔ مترجم جس زبان سے ترجمہ کر رہا ہے اور جس زبان میں کر رہا ہے، ضروری ہے کہ وہ دونوں کا بخوبی ماہر اور ان کے اسرار

ور موز سے اچھی طرح واقف ہو۔ نیز اسے دونوں زبانوں کی وضع، اسلوب اور دلالت کا بھی اچھی طرح علم ہو۔

۲۔ مترجم کسی ایسے فاسد عقیدے کی طرف ذرا بھی میلان نہ رکھتا ہو جو قرآنی تعلیمات سے ٹکراتا ہو۔ اس شرط کا مفسر میں بھی پایا جانا ضروری ہے۔ کیوں کہ مترجم یا مفسر کا میلان اگر کسی فاسد عقیدے کی طرف ہو گا تو وہ عقیدہ اس کے فکر و نظر پر چھا جائے گا، چنانچہ وہ اپنی خواہش یا رجحان کے مطابق جو کچھ تفسیر یا ترجمہ کرے گا، اس میں قرآنی فکر سے بہت دور نکل جائے گا۔ (۲)

مرورِ زمانہ کے ساتھ ترجمہ ایک فن کی حیثیت اختیار کرتا گیا۔ مترجمین نے ایسا ترجمہ کرنے کی کوشش کی جس میں قرآن کے الفاظ کی بھی پابندی کی گئی ہو اور ترسیل معنی کی طرف بھی خصوصی توجہ دی جائے۔ اس مقصد کے لیے مترجمین نے قوسین کا استعمال کیا تاکہ وہ الفاظ جو ترجمہ میں ترسیل معنی، ربط کلام اور محاوراتی حسن کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہیں ان کو قوسین میں ذکر کیا جاسکے۔ جس طرح فن تفسیر پر کام کرنے والے افراد مختلف رجحانات و مسالک سے وابستگی رکھتے تھے اور اسی وابستگی کی بنا پر مختلف ذوق و مسالک کی متحمل تفاسیر سامنے آئیں۔ اسی طرح مترجمین قرآن مسالک اور رجحانات اور ذوق میں اختلاف رکھتے تھے اور اس اختلاف کا اثر تراجم پر بھی اثر انداز ہوا اور اسی اختلاف کو مد نظر رکھتے ہوئے ہی تراجم میں ان کا لحاظ برتا گیا۔ ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی نے اس کی نشان دہی درج ذیل الفاظ میں کی ہے:

> ”کوئی بھی عالم اپنے ذوق، مزاج اور رجحانات سے الگ نہیں ہو سکتا، ترجمۂ قرآن میں اگرچہ ان کا رنگ و آہنگ شامل ہونا ترجمۂ قرآن کے مقصد و منہاج سے مطابقت نہیں رکھتا اور اس سے گریز کرنا ہر مترجم کی اولین ذمے داری ہے، مگر اس کو کیا کیجیے کہ اردو تراجمِ قرآن کے ذخیرے میں بھی تفسیر کی طرح مترجم کے ادبی و لسانی ذوق، فقہی و مسلکی رجحان اور کلامی رنگ کی اثر انگیزی دیکھنے کو مل جاتی ہے۔“ (۳)

آئندہ سطور میں سورہ الفاتحہ اور سورہ البقرہ میں سے چند مقامات کی نشاندہی کی جاتی ہے جہاں اردو ترجمۂ قرآن پر آیات کے کلامی پہلوؤں کے لحاظ کے اثرات کا مطالعہ پیش کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں جن مختلف اردو تراجم کا تجزیہ کیا گیا ہے ان کے مترجمین کے اسماء اور ان کے قلمی نام کا گوشوارہ درج ذیل ہے۔ مگر آیت کے تحت صرف وہی منتخب پانچ تراجم ہی ذکر کیے گئے ہیں جن میں کلامی پہلو کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

ترجمے کا نام	مترجم	مترجم کا قلمی نام
تفسیر القرآن وہو الہدٰی والفرقان	سر سید احمد خان	سر سید
ترجمہ قرآن	محمود حسن دیوبندی	محمود حسن
کنز الایمان	احمد رضا خان	احمد رضا
بیان القرآن	اشرف علی تھانوی	اشرف علی تھانوی
تفسیر ثنائی	ثناء اللہ امر تسری	ثناء اللہ امر تسری

ترجمان القرآن	ابو الکلام آزاد	آزاد
تفہیم القرآن	سید ابو الاعلیٰ مودودی	مودودی
ضیاء القرآن	پیر محمد کرم شاہ الازہری	پیر محمد کرم شاہ الازہری
عمدۃ البیان	مفتی غلام سرور قادری	مفتی غلام سرور
تبیان القرآن	غلام رسول سعیدی	سعیدی
تبیان الفرقان	غلام رسول سعیدی	سعیدی
بلاغ القرآن	محسن علی نجفی	نجفی

مثال نمبرا

فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ۔(۴)

"کہ حد سے بڑھنے والوں میں ہو جاؤ گے۔"(احمد رضا)

"ورنہ ہو جاؤ گے اپنا حق تلف کرنے والوں سے۔"(کرم شاہ الازہری)

"ورنہ ظالموں میں شمار ہو گے۔"(مودودی)

"حد سے تجاوز کر بیٹھو گے اور ان لوگوں میں سے ہو جاؤ گے جو زیادتی کرنے والے ہیں۔"(آزاد)

"نہیں تو ظالموں میں ہو گے۔"(سر سید)

زیر نظر تراجم میں محل غور کلمہ "ظالمین" ہے جس کا ترجمہ بعض مترجمین نے تو ظالم ہی کیا ہے جن میں سر سید اور مودودی صاحب شامل ہیں۔ جبکہ دیگر نے "حد سے بڑھ جانے والے۔ اپنا حق تلف کرنے والے، زیادتی کرنے والے" کیا ہے۔ یہ تراجم بالترتیب احمد رضا، کرم شاہ الازہری اور آزاد صاحب ہیں۔

ظلم کے بارے تحقیق کرتے ہوئے علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

الظلم اصله وضع الشئی فی غیر موضعه والارض المظلومة التی لم تحفر قط ثم حفرت۔(۵)

"یعنی کسی چیز کو اس کے مقام سے ہٹا کر رکھنا ظلم ہے۔ وہ زمین جس کو کبھی کاشت نہ کیا گیا اور پھر کاشت کیا جائے۔"

مولانا مودودی ظلم کی تحقیق کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ظلم کا لفظ نہایت معنی خیز ہے۔ ظلم در اصل حق تلفی کو کہتے ہیں۔ ظالم وہ ہے جو کسی کا حق تلف کرے، جو شخص خدا کی نافرمانی کرتا ہے وہ در حقیقت تین بنیادی حقوق کو تلف کرتا ہے۔ اولاً: خدا کا حق تلف کرتا ہے۔ ثانیاً: ان تمام اشیا کا حق جن کو ظلم کرتے ہوئے استعمال میں لایا۔ ثالثاً اپنا حق کہ وہ اپنے آپ کو تباہی

سے بچائے۔"(۶)

لفظ ظلم کی تحقیق کے بعد دیکھنا یہ ہے کہ کن کے لیے یہ لفظ بولا گیا ہے۔تو پتا چلتا ہے کہ حضرت آدم و حوا سلام اللہ علیہما کے لیے یہ الفاظ استعمال کیے گئے۔اور وہ اس ممنوعہ شجر کے پاس بھی گئے تھے۔اس لیے باری تعالی اپنے نبی کے لیے جو لفظ چاہے استعمال کرے مگر ہمیں خلاف ادب کلمہ نہیں لانا چاہیے۔اس لیے اس کا ترجمہ ظالم ہی کرنا مناسب نہیں کیونکہ ہمارے عرف میں عزت دار اور شریف آدمی کے لیے ظالم کا لفظ گالی کے مترادف ہے۔چہ جائے کہ نبی جیسی عظیم المرتبت ہستی کے لیے یہ لفظ استعمال کیا جائے۔اسی طرح "زیادتی کرنے والے" کا لفظ بھی انبیا کے لیے مناسب نہیں ہے۔

انبیا چونکہ معصوم عن الخطا ہوتے ہیں اس لیے ان سے اگر کوئی ایسا کام سرزد ہو جائے تو وہ خلاف اولیٰ کام کے زمرے میں آئے گا۔خلاف اولیٰ کام کی صورت میں ظالم کا معنیٰ "حد سے بڑھ جانے والا" کسی حد تک جبکہ " اپنا حق تلف کرنا" کا معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ خلاف اولیٰ کام کی صورت میں صرف ثواب کی کمی ہوتی ہے۔جو کہ صرف اپنی حق تلفی ہے۔

مثال نمبر ۲

فَأَيْنَمَا تُوَلُّواْ فَثَمَّ وَجْهُ اللّهِ۔(۷)

"جس طرف بھی تم رخ کروگے اللہ کا رخ ہے۔"(مودودی)

"تو تم جدھر منھ کرو ادھر وجہ اللہ (خدا کی رحمت تمھاری طرف متوجہ) ہے۔"(احمد رضا)

"سو جدھر بھی تم رخ کرو وہیں ذات خداوندی ہے۔"(کرم شاہ الازہری)

"تو تم (قبلہ کی سمت معلوم نہ ہونے کی صورت میں) جدھر بھی منھ کرو پس ادھر اللہ کی (رضا) ہے۔"(مفتی غلام سرور)

"جدھر منھ کرو پھر ادھر ہی خدا کا منھ (یعنی اس کی ذات) ہے۔"(سرسید)

اس آیت کریمہ میں "وجہ اللہ" کے ترجمے میں ہمارے فاضل مترجمین کے ہاں اختلاف ہے اور اس اختلاف کی وجہ ایک کلامی مسئلہ ہے۔علمائے علم الکلام کے نزدیک اللہ تعالی کی ذات مکان، جہت، زمان، جسم، جواہر اور حدوث سے پاک ہے اس کی پاک ذات کے لیے جب بھی ایسے الفاظ استعمال ہوں گے تو ان کی تاویل کی جائے گی کیونکہ وہ ذات قدیم اور واجب الوجود ہے۔

علامہ تفتازانی لکھتے ہیں :

المحدث للعالم هو الله تعالى الواحد الحى القادر العليم السميع البصير المريد ولا جسم ولا جوهر ولا محدود ولا معدود ولا متجز ولا متركب منها ولا متناه ولا يوصف بالماهية ولا بالكيفية ولا يتمكن فى مكان ولا يجرى عليه زمان ولا يشبهه شيء۔(۸)

"عالم کو حدوث بخشنے والا وہ اللہ تعالی ہی ہے جو تنہا، (از خود) زندہ، قادر، سب جاننے اور سننے والا، ارادہ کرنے والا ہے، نہ وہ مجسم ہے نہ جوہر، نہ وہ محدود ہے اور نہ ہی گنا جا سکتا، نہ وہ اجزا میں بٹتا، اور نہ ہی وہ اجزا سے ترکیب پاتا، اس کی کوئی انتہا نہیں، اس کی ماہیت و کیفیت کی کوئی تعریف نہیں، نہ اس پر مرور زمانہ کا اثر ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی شے اس کے مشابہ ہے۔"

آیت میں "وجہ اللہ" کا کلمہ ہے جس کا لفظی ترجمہ تو اللہ کا چہرہ ہے۔ اور چہرہ اعضائے جسمانیہ میں سے ہے۔ جب باری تعالی کے لیے جسم ہی ثابت نہیں تو پھر اردو میں ترجمہ کرتے ہوئے ان الفاظ کا لحاظ رکھتے ہوئے ایسی تاویل کی جائے گی جو اللہ تعالی کی ذات وصفات سے مناسبت رکھتی ہو۔ اس لحاظ کی وجہ سے تراجم میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

کچھ مترجمین نے قوسین کے استعمال کے بغیر ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جس سے "وجہ اللہ" کی تاویل بھی ہوئی ہے اور علم کلام کے اصولوں کو بھی مد نظر رکھا گیا ہے۔ یہ بات ہم پہلے واضح کرتے ہیں کہ ہمارے فاضل مترجمین میں سے کوئی بھی یہ اعتقاد نہیں رکھتا کہ خدا تعالی کا کوئی مثل انسانی وجود ہے یا کوئی جہت و مکان مخصوص مذکورہ بالا تراجم میں سے حضرات سرسید اور کرم شاہ الازہری کے تراجم سے ذات باری تعالی کے مجسم ہونے کا شائبہ پڑتا ہے۔ جبکہ مودودی صاحب کے ترجمے میں "رخ" سے جہت اور چہرہ دونوں مراد لی جا سکتی ہیں۔ احمد رضا اور مفتی غلام سرور کے علاوہ تمام مترجمین "وجہ اللہ" کے لیے ترجمے میں جو الفاظ لائے ہیں ان سے اللہ تعالی کے لیے جسم، جہت اور مکان کا شائبہ پڑتا ہے۔ جبکہ مذکورہ بالا مترجمین نے بالترتیب "وجہ اللہ (خدا کی رحمت تمھاری طرف متوجہ)، اللہ کی (رضا)" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ان تمام میں سے سب سے بہتر لفظ مفتی غلام سرور صاحب نے قوسین کے استعمال کے ذریعے ذکر کیا ہے۔ کیونکہ دیگر آیات قرآنیہ میں بھی وجہ اللہ سے یہ مراد ہے۔ علامہ قرطبی لکھتے ہیں :

وقيل :المعنى فثم وجه الله رضاالله وثوابه؛كما قال:انما نطعمكم لوجه الله؛ لرضاۂ و طلب وثوابه؛ومنه قوله عليه السلام من بنى مسجداًيبتغى به وجه الله بنى الله له مثله فى الجنة۔"(۹)

"وجہ اللہ سے مراد اللہ کی رضا و ثواب ہے۔ جس طرح انما نطعمکم لوجہ اللہ سے مراد اللہ کی رضا اور اس کی جناب سے ثواب کا حصول ہے۔ اور حضور سید عالم ﷺ کا ارشاد گرامی (من بنی مسجداً یبتغی بہ وجہ اللہ بنی اللہ لہ مثلہ فی الجنۃ) میں بھی "وجہ اللہ" سے "اللہ کی رضا" مراد ہے۔"

مثال نمبر ۳

وَلَا تَنفَعُهَا شَفَاعَةٌ۔(۱۰)

"اور نہ کافر کی کوئی سفارش نفع دے گی۔" (احمد رضا)

"اور نہ نفع دے گی اسے کوئی سفارش۔" (کرم شاہ الازہری)

"اور نہ اس (کافر) کو کوئی سفارش نفع دے گی۔" (مفتی غلام سرور)

"نہ کسی کی سعی و سفارش چل سکے گی (کہ ان کا وسیلہ پکڑ کے کام نکال لو)۔" (آزاد)

"اور نہ کسی کو کوئی سفارش (جبکہ ایمان نہ ہو) مفید ہو گی۔" (اشرف علی تھانوی)

طوالت کے خوف سے آیت کے صرف اسی حصے کا ترجمہ لکھا گیا ہے جس میں کلامی رجحان کی وجہ سے اختلاف پایا جاتا ہے۔ علمائے اسلام میں اس بات پر اختلاف پایا جاتا ہے کہ آیا مومن کی شفاعت کسی دوسرے مومن کے حق میں نفع بخش ہے کہ نہیں؟ کچھ علما تو یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ مومن کی شفاعت دوسرے مومن کے حق میں کارگر ثابت ہو گی۔ لیکن کافر کے حق میں نفع بخش نہیں ہے۔ جبکہ دیگر علماء کا نقطہ نظر یہ ہے کہ کسی بھی شخص کی شفاعت کسی بھی دوسرے شخص کے حق میں فائدہ مند نہ ہو گی اس کلامی رجحان کے اثر کی وجہ سے تراجم قرآن میں اختلاف نظر آتا ہے۔

اب وہ علماء جن کے نزدیک مومن کی شفاعت مومن کے حق میں ثابت بالنفع ہے اور کافر کے حق میں مفید نہیں ان کے اس رجحان کا اثر ترجمۂ قرآن میں بھی نظر آتا ہے۔ جیسے احمد رضا صاحب نے قوسین کے استعمال سے اور مفتی صاحب نے قوسین کے بغیر بالترتیب "کافر" کا لفظ لکھ کر یہ تاثر دیا ہے کہ یہ شفاعت کا قبول نہ ہونا صرف کفار کے حق میں ہو گا۔ مومن کو دوسرے مومن کی شفاعت نفع دے گی۔

سید نعیم الدین مراد آبادی تفسیری حاشیے میں لکھتے ہیں :

"اس میں یہود کا رد ہے جو کہتے تھے کہ کہ ہمارے باپ دادا بزرگ گزرے ہیں ہمیں شفاعت کر کے چھڑا لیں گے انھیں مایوس کیا جاتا ہے کہ شفاعت کافر کے لیے نہیں ہے۔"(۱۱)

یہی تاثر مولانا اشرف علی تھانوی نے قوسین میں "جبکہ ایمان نہ ہو" کے الفاظ استعمال کر کے دیا ہے کہ جب تک کوئی شخص صاحب ایمان نہ ہو گا اسے کسی بھی شخص کی شفاعت نفع نہ دے گی۔

علامہ شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں :

"حق تعالیٰ نے اسی ترتیب کے موافق ارشاد فرمایا کہ کوئی شخص گو کیسا ہی مقرب خداوندی ہو مگر کسی نافرمان عدو اللہ کافر کو منجملہ چاروں صورتوں کے کسی صورت سے نفع نہیں پہنچا سکتا۔"(۱۲)

آزاد صاحب نے قوسین میں "کہ ان کا نام پکڑ کر کام نکال لو" کے الفاظ استعمال کر کے یہ تاثر دیا ہے کہ کسی بھی شخص کی سفارش یا شفاعت کسی بھی حالت میں کسی کے لیے کارگر ثابت نہ ہو گی۔ دیگر مترجمین نے اپنے تراجم میں لفظی پابندی کی ہے۔ البتہ ترسیلِ معنی کے اعتبار سے وہ تراجم جن میں "کافر" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے وہ زیادہ بہتر ہیں کیونکہ ایک لفظ کے استعمال سے اہل سنت کے ایک بڑے مؤقف کی تائید اور معتزلہ کا رد ہو رہا ہے۔ معتزلہ اسی آیت سے استدلال کرتے ہوئے مسئلہ شفاعت کا انکار کرتے ہیں۔

علامہ قرطبی لکھتے ہیں :

قداجمع المفسرون علی ان المراد بقوله تعالی وَاتَّقُواْ يَوْماً لاَّ تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئاً وَلاَ يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلاَ تَنفَعُهَا شَفَاعَةٌ النفس الکافرہ لا کل نفس۔ (۱۳)

"تمام مفسرین کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی وَاتَّقُواْ يَوْماً لاَّ تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئاً وَلاَ يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلاَ تَنفَعُهَا شَفَاعَةٌ سے مراد کافر کا نفس ہے، ہر نفس مراد نہیں ہے۔"

علامہ سعد الدین تفتازانی کفار کے حق میں شفاعت کے نہ ہونے اور مومنین کے حق میں شفاعت کے قبول ہونے کو بیان کرتے ہیں:

الشفاعۃ ثابتۃ للرسل والاخیار فی حق اھل الکبائر بالمستفیض من الاخبار۔ (۱۴)

"احادیث سے رُسل کرام اور مخصوص لوگوں کا اہل کبائر کے حق میں شفاعت کرنا ثابت ہے۔"

معتزلہ کے استدلال کا رد کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

والجواب بعد تسلیم دلالتھا علی العموم فی الاشخاص والازمان والاحوال انہ یجب تخصیصھا بالکفار۔ (۱۵)

"اشخاص، زمانہ اور احوال کے عموم پر اس آیت کی دلالت کو تسلیم کرنے کے بعد جواب یہ ہے کہ یہ آیت کفار کے ساتھ خاص ہے۔"

یہی اختلاف درج ذیل آیات میں بھی پایا جاتا ہے:

وَلاَ يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ۔ (۱۶)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ أَنفِقُواْ مِمَّا رَزَقْنَاكُم مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ يَوْمٌ لاَّ بَيْعٌ فِيهِ وَلاَ خُلَّةٌ وَلاَ شَفَاعَةٌ۔ (۱۷)

مثال نمبر ۵

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنتَ عَلَيْهَا إِلاَّ لِنَعْلَمَ مَن يَتَّبِعُ الرَّسُولَ۔ (۱۸)

"اور نہیں مقرر کیا ہم نے (بیت المقدس کو) قبلہ جس پر آپ (اب تک) رہے مگر اس لیے کہ ہم دیکھ لیں کہ کون پیروی کرتا ہے (ہمارے) رسول کی۔" (کرم شاہ الازہری)

"اور (اے حبیب) ہم نے اس قبلہ (کعبہ) کو جس پر تم (ہجرت سے پہلے) تھے اس لیے (دوبارہ قبلہ) مقرر کیا تاکہ ہم اسے جو رسول اللہ ﷺ کی (دل سے) پیروی کرتا ہے ان لوگوں سے الگ کر دیں جو (ایسی آزمائش کے وقت کفر کی طرف) الٹے پاؤں پھر جاتے ہیں۔" (مفتی غلام سرور)

"اور نہیں مگر کیا تھا ہم نے وہ قبلہ کہ جس پر تو پہلے تھا مگر اس واسطے کہ معلوم کریں کون تابع رہے گا رسول کا اور پھر جائے گا الٹے پاؤں۔" (محمود حسن)

"اور آپ پہلے جس قبلے کی طرف رخ کرتے تھے اسے ہم نے صرف اس لیے مقرر کیا تھا تاکہ ہم رسول کی اتباع کرنے والوں کو الٹا پھرنے والوں سے پہچان لیں۔" (نجفی)

"اور جس سمت قبلہ پر آپ رہ چکے ہیں وہ تو محض اس لیے تھا کہ ہم کو معلوم ہو جاوے کہ کون رسول اللہ ﷺ کی اتباع اختیار کرتا ہے اور کون پیچھے کو ہٹتا جاتا ہے۔" (اشرف علی تھانوی)

"اور اگر ہم نے اتنے دنوں تک تمھیں اسی قبلہ پر رہنے دیا جس کی طرف تم رخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔ تو یہ اس لیے تھا تاکہ (وقت پر) معلوم ہو جائے کہ کون لوگ اللہ کے رسول ﷺ کی پیروی میں سچے ہیں اور کون لوگ (دل کے کچے ہیں، جو آزمائش میں پڑ کر) الٹے پاؤں پھر جانے والے ہیں۔" (آزاد)

اس آیت کریمہ میں قابل غور کلمہ "**لنعلم**" ہے۔ اس میں لام تعلیل کا ہے اور نعلم فعل مضارع معروف صیغہ جمع مذکر ہے، جس کا معنی ہے "ہم (زمانہ مستقبل میں) جان لیں گے۔"

معاملہ یوں ہے کہ باری تعالیٰ کا علم ذاتی ہے۔ اور ہر چیز اپنی اصل وابد کے اعتبار سے اس کے حیطۂ علم میں ہے تو پھر اس کلمہ کا ترجمہ یہ کرنا کہ "ہم جان لیں گے یا ہمیں معلوم ہو جائے" مناسب نہیں۔ کیونکہ ان الفاظ کے استعمال سے یہ اشتباہ پڑتا ہے کہ العیاذ باللہ باری تعالیٰ کے علم میں یہ باتیں پہلے موجود نہ تھیں وقوع پذیر ہونے کے بعد اس کے حیطۂ ادراک میں آئیں۔ آیت کے اس کلامی پہلو کا لحاظ رکھتے ہوئے کچھ مترجمین نے دیگر الفاظ استعمال کیے ہیں علامہ کرم شاہ الازہری نے "دیکھ لیں" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ جس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ یہاں علم بمعنی نرٰی استعمال ہوا ہے۔

اس پر استدلال کرتے ہوئے علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

قال علی رضی اللہ عنہ معنی (لنعلم) لنری، والعرب تضع العلم مکان الرؤیۃ والرؤیۃ مکان العلم۔ (۱۹)

"حضرت علیؓ نے فرمایا کہ نعلم کا معنی نرٰی ہے اور عرب علم کی جگہ رویت اور رویت کی جگہ علم کے الفاظ استعمال کرتے رہتے ہیں۔"

دیگر مترجمین میں سے مفتی غلام سرور صاحب نے "الگ کرنا" کے الفاظ ذکر کیے ہیں۔ جہاں علم بمعنی ممیّز کے استعمال ہوا ہے۔ اس کے متعلق بھی علامہ قرطبی لکھتے ہیں۔

وقیل: لنمیز اھل الیقین من اھل الشک۔ (۲۰)

"کہا گیا ہے کہ ہم اہل یقین کو اہل شک سے ممتاز کر دیں۔"

اور محسن علی نجفی صاحب نے علم بمعنی عرف استعمال کرتے ہوئے ترجمے میں "پہچان لیں" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

مذکورہ مترجمین نے علم کا ترجمہ کرتے ہوئے ان الفاظ کا استعمال کیا ہے جن کی وجہ سے ذات باری تعالی کے علم قدیم پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ البتہ اب ہم ان مترجمین کا ذکر کرتے ہیں جن کے ترجمے سے باری تعالی کے علم کے حادث ہونے کا اشتباہ پڑتا ہے۔

مولانا محمود الحسن، مولانا اشرف علی تھانوی اور آزاد صاحب نے بالترتیب "معلوم کریں، معلوم ہو جاوے اور معلوم ہو جائے" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ جن سے یہ اشتباہ پڑتا ہے کہ العیاذ باللہ شاید پہلے لوگوں کا یہ رد عمل اللہ کے علم میں نہیں تھا اب حصول علم کے لیے یہ عمل کیا جارہا ہے۔ ترجمہ کرتے ہوئے اگرچہ اس کلامی پہلو کا لحاظ نہیں رکھا گیا البتہ مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا محمود الحسن صاحب کے تفسیری حواشی میں اس پہلو پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ جس کا یہاں ذکر کرنا خالی از فائدہ نہ ہو گا۔

علامہ شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں:

"اس آیت میں لنعلم جو صیغہ استقبال ہے او دیگر آیات میں جو حتی نعلم اورفلیعلمناور لم یعلم الله اور لنبلونکم الا لنعلم وغیرہ کلمات موجود ہیں ان سب سے بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ حق تعالی کو نعوذ باللہ ان اشیا کا علم بعد میں ہوا ان چیزوں کے وجود سے پہلے علم نہ تھا۔ حالانکہ اس کا علم ہر چیز کے ساتھ قدیم ہے۔ کان الله بکل شیء علیماً۔ علما نے کئی طرح سے اس کا جواب دیا ہے۔ بعض نے علم سے متمیز اور جدا جدا کر دینا مراد لیا ہے۔ بعض نے امتحان کے معنی لیے ہیں۔ کسی نے علم کو بمعنی رویت لیا کسی نے مستقبل کو بمعنی ماضی فرمایا بعض نے حدوث علم کو نبی اور مومنین کی طرف رجوع کیا یا مخاطبین کی طرف لوٹایا بعض اکابر محققین نے علم حالی جو بعد وجود معلوم متحقق ہوتا ہے جس پر جزا و سزا اور مدح و ذم مرتب ہوتی ہے، مراد لیا ہے اور اسی کو پسند کیا ہے۔ بعض راسخین مدققین نے اس کے متعلق دو باتیں نہایت دقیق اور انیق بیان فرمائیں اول کا خلاصہ یہ ہے کہ حسب ارشاد اِنَّ اللّٰهَ قَد اَحَاط بِکُلِّ شَیءٍ عَلِیما تمام چیزیں اول سے آخر تک حقیر و عظیم قلیل و کثیر خدا کے سامنے ہیں اور سب کا علم اس کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے علم میں تقدم و تاخر ہر گز نہیں مگر آپس میں ایک دوسرے کی نسبت بے شک مقدم و مؤخر گنی جاتی ہیں۔ سو علم خداوندی کے لحاظ سے تو سب کی سب بمنزلہ شی واحد موجود ہیں۔ اس لیے وہاں ماضی، حال اور استقبال نکالنا غلط ہو گا۔ البتہ تقدم و تاخر باہمی کی وجہ سے یہ تینوں زمانے بالبداہت جدا جدا نکلیں گے سو جناب باری تعالیٰ کبھی تو حسب موقع حکمت اپنے معلوم ہونے کے لحاظ سے کلام فرماتا ہے۔ اور کبھی ان وقائع کے تقدم و تاخر کا لحاظ ہوتا ہے۔ پہلی صورت میں تو ہمیشہ بلحاظ ایک فرق دقیق کے ہمیشہ ماضی کا صیغہ یا حال کا صیغہ مستعمل ہوتا ہے۔ استقبال کا صیغہ مستعمل نہیں ہو سکتا اور دوسری صورت میں ماضی کے موقعے میں ماضی اور حال کے موقعے میں حال اور استقبال کی جگہ استقبال لایا جاتا ہے۔ سو

جہاں کہیں وقائع آئندہ کو ماضی کے الفاظ میں مستعمل فرمایا ہے جیسے وَنَادَیٰ اَصحَابُ الجَنَّة وغیرہ تو وہاں اس کا لحاظ ہے کہ حق تعالیٰ کو سب مستحضر اور پیش نظر ہے اور جہاں امور گذشتہ کو صیغہ استقبال سے بیان فرمایا جیسا اسی آیت میں الا لنعلم ہے یا اور اس کے سوا تو وہاں یہ مد نظر ہے کہ بہ نسبت اپنے ماقبل کے مستقبل ہی علم الہیٰ کے لحاظ سے استقبال نہیں جو اس کے علم میں حدوث کا وہم ہو۔دوسری تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم کو علم اشیا دو طریق پر حاصل ہوتا ہے۔ایک تو بلاواسطہ، دوسرا بالواسطہ... سو جہاں کہیں بھی علم خداوندی کے ذکر میں صیغہء استقبال کا یا معنی استقبال کے پائے جاتے ہیں وہ علم بالواسطہ کے لحاظ سے ہی زمانہ کے اعتبار سے کچھ تفاوت نہیں اور جہاں کہیں ماضی یا حال مستعمل ہو وہاں علم بلاواسطہ مراد ہے اور علم بلاواسطہ کے اعتبار سے کلام فرمانے میں یہ حکمت ہے کہ کلام الہی کے مخاطب آدمی ہیں اور ان کو اکثر اشیا کا علم بالواسطہ ہوتا ہے اور جہاں کہیں جناب باری نے اپنے علم میں صیغۂ استقبال استعمال فرمایا ہے۔وہ وہی امور ہیں جو بنی آدم کو بلاواسطہ معلوم نہیں ہوسکتے اگر ایسے مواقع میں بنی آدم سے باعتبار علم بلا واسطہ کلام کیا جاتا تو ان پر پورا الزام نہ ہوتا اور جہاں یہ مصلحت نہیں وہاں باعتبار علم بلاواسطہ صیغۂ ماضی یا حال کا استعمال کیا جاتا ہے بنی آدم کو چونکہ ان اشیا کا علم بلاواسطہ ہو ہی نہیں سکتا۔اور ان واسطوں کا علم قبل ان کے وجود کے بنی آدم کو ممکن نہیں اور اس وجہ سے ان کے تمام علوم برابر حاصل نہیں ہوتے تو وہ خدا کو اپنے اوپر قیاس کر کے صیغۂ استقبال سے حدوث سمجھ جاتے ہیں اور حیران ہوتے ہیں کہ علم الہی میں تو حدث ثابت ہو گیا مگر فہمیدہ اشخاص جو نکتہ مذکورہ سے واقف ہیں سب کو مطابق یک دگر سمجھتے ہیں "(۲۱)

مزید اس آیت میں ایک کلمہ "القبلہ" آیا ہے اس کی تعیین میں اختلاف کو چند مترجمین نے قوسین میں ظاہر کیا ہے۔ابتدائے اسلام میں مسلمان بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے جبکہ ہجرت کے بعد تحویل کعبہ کا حکم نازل ہوا تو حضور سید عالم ﷺ نے اپنے صحابہ کو کعبہ معظمہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم ارشاد فرمایا۔مفتی غلام سرور قادری صاحب کے علاوہ تمام مترجمین کے تراجم سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ معانی قرآن یہ ہیں کہ یا رسول اللہ ﷺ آپ کے لیے پہلے پہل بیت المقدس کو صرف اس لیے قبلہ بنایا تھا کہ متبعین رسول ﷺ کو دیکھ لیا جائے مگر مفتی غلام سرور قادری صاحب نے قوسین میں چند الفاظ استعمال کر کے جو تاثر دیا ہے اس سے معانی قرآن یہ بنتے ہیں کہ یا رسول اللہ ﷺ آپ کا قبلہ اول بھی کعبہ معظمہ ہی ہے۔اب اسی کو دوبارہ مقرر کر کے ہم لوگوں کی آزمائش کر رہے ہیں۔

اگر فکر و تدبر کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہجرت سے قبل اگرچہ حضور سید عالم ﷺ ایسی سمت میں نماز ادا فرماتے تھے کہ کعبہ اور بیت المقدس ایک ہی سمت میں آجائیں۔لیکن اس وقت تک باری تعالیٰ کی طرف سے کوئی واضح اور الگ حکم موجود نہیں تھا اس لیے بیت المقدس ہی مسلمانوں کا قبلہ اول تھا اور جو تحویل قبلہ کا حکم دیا گیا ہے۔یہ بیت المقدس سے کعبہ معظمہ کی طرف ہے۔لیکن مفتی صاحب کے ترجمے سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہجرت سے

پہلے بھی کعبہ ہی حضور سید عالم ﷺ کا قبلہ تھا تو پھر اس کو دوبارہ مقرر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ مزید قرآن شریف کے یہ الفاظ "کنت علیھا" اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ اب جسے قبلہ متعین کیا جارہا ہے یہ پہلے کے علاوہ ہے۔

سو یہ ثابت ہوا کہ قبلۂ اول بیت المقدس ہی تھا اور اس کو آپ ﷺ کا قبلہ صرف اس لیے قرار دیا گیا تھا کہ جب تحویل قبلہ کا حکم نازل ہو تو لوگوں کی آزمائش کرلی جائے کہ کون حضور نبی رحمت ﷺ کی اتباع کرتا ہے اور کون نسلی تعصبات وروایات کو ہی اپنائے رکھتا ہے۔

اس کے علاوہ مفتی غلام سرور صاحب نے "کنت" کی ضمیر مخاطب جس کا مرجع حضور ﷺ ہیں کے اظہار کے لیے قوسین میں "اے حبیب ﷺ" کے الفاظ استعمال کیے ہیں جو کہ مترجم کے ذوق کا اثر ہے۔

مثال نمبر ۴

هلْ يَنظُرُونَ إِلاَّ أَن يَأْتِيَهُمُ اللّهُ فِي ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلآئِكَةُ۔ (۲۲)

" کیا وہ اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ آئے ان کے پاس اللہ کا عذاب چھائے ہوئے بادلوں (کی) صورت میں۔" (کرم شاہ الازہری)

" کیا یہ لوگ منتظر ہیں کہ خود اللہ بادلوں کے سائبان میں ان کے پاس آئے۔" (محسن علی نجفی)

" یہ لوگ صرف اس امر کے منتظر ہیں کہ حق تعالیٰ اور فرشتے بادل کے سائبانوں میں ان کے پاس آویں اور سارا قصہ ہی ختم کر دیا جاوے۔" (اشرف علی تھانوی)

" کیا وہ (اسلام لانے میں دیر کرنے والے) اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ بادل کے سایوں میں ان کے پاس اللہ (کا عذاب) اور فرشتے آئیں اور (ان کی ہلاکت کا) کام پورا کر دیا جائے؟" (مفتی غلام سرور)

"کاہے کا انتظار میں ہیں مگر یہی کہ اللہ کا عذاب آئے چھائے ہوئے بادلوں میں اور فرشتے اتریں اور کام ہو چکے۔" (احمد رضا)

اس آیت کریمہ میں محل غور کلمہ أَن يَأْتِيَهُمُ اللّه جس کا لفظی ترجمہ تو یہی بنتا ہے کہ "اللہ ان کے پاس آئے" لیکن "آنا، جانا چلنا پھرنا یہ صفات مجسم اذوات کی ہیں، باری تعالی کی ذات واجب الوجود تو ہے۔ لیکن انسانوں کی طرح مجسم نہیں اس کے لیے کوئی جہت یا سمت مخصوص نہیں اور نہ ہی اسے کسی جگہ مقید کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے اس کلمات کا ترجمہ کرتے ہوئے آیت کے اس کلامی پہلو کا لحاظ رکھا جائے گا اور ایسے الفاظ ذکر کیے جائیں گے جو ذات باری تعالی کے لیے مناسب ہوں۔ ہمارے فاضل مترجمین میں سے پیر محمد کرم شاہ الازہری اور احمد رضا خان صاحب نے 'أَن يَأْتِيَهُمُ اللّه کا ترجمہ اللہ کا عذاب ان کے پاس آئے کیا ہے۔ اور مفتی غلام سرور صاحب نے قوسین کے استعمال کے ذریعے "اللہ کا عذاب" ترجمہ کیا ہے۔ بقیہ تمام مترجمین نے اس سے اللہ تعالیٰ کی ذات کا آنا مراد لیا ہے۔

پیر محمد کرم شاہ الازہری صاحب حاشیے میں لکھتے ہیں:

"اس آیت میں بظاہر آنے کی نسبت اللہ تعالی کی طرف ہے لیکن آنا جانا جسم کی صفتیں ہیں اور اللہ تعالی جسم اور اس کی صفتوں سے پاک اور منزہ ہے۔اس کے علمائے سلف کی متفق رائے یہ ہے کہ ایسی تمام آیتیں متشابہات سے ہیں اور ان کا حقیقی مفہوم اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ہمیں اس کے متعلق سکوت کرنا چاہیے۔**قال سفیان بن عیینه کل ما وصف الله به نفسه ....لیس لاحد ان یفسره الا الله ورسوله.قال ابو حنیفة**(مظہری) لیکن علمائے متاخرین کا مسلک یہ ہے کہ ان آیات کی ایسی تاویل کرنا جو ان کی شایان شان ہو درست ہے۔چنانچہ علامہ بیضاوی اور دوسرے مفسرین نے یہاں آیت میں مضاف محذوف مانا ہے یعنی اصل عبارت یوں تھی۔أَن يَأْتِيَهُمُ اللّٰه وَبَأْسُهٗ اور لغت عرب میں مضاف کا حذف عام مستعمل ہے۔میں نے ترجمہ اسی قول کے مطابق کیا ہے۔"(۲۳)

دیگر تمام وہ مترجمین جنھوں نے أَن يَأْتِيَهُمُ اللّٰه کا ترجمہ اللہ تعالی کا آنا کیا ہے ان میں سے صرف مولانا اشرف علی تھانوی بیان کرتے ہیں کہ آیت میں اس قصے کی طرف اشارہ ہے جو کہ روح المعانی میں مذکور ہے۔

علامہ آلوسی لکھتے ہیں :

اخرج ابن مردویه عن ابن مسعود عن النبی ﷺ یجمع الله تعالی الاولین والآخرین لیمیقات یوم معلوم قیاما شاخصة ابصارهم الی السماء ینظرون الی السماء فعل القضاء وینزل الله تعالی فیظلل من الغمام من العرش الی الکرسی واخرج ابن جریر وغیره عن عبدالله بن عمر فی هذه الآیة قال:یهبط حین یهبط و بینه و بین خلقه سبعون الف حجاب منها النور.....والظلمة.....والماء فیصوت الماء فی تلک العظمة صوتاً تنخلع له القلوب وعن ابن عباس ﷺ ان من الغمام ظلاًیاتی الله تعالیٰ فیها محفوفات بالملائکة۔"(۲۴)

"حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالی اولین وآخرین کو قیامت کے دن مقام مخصوص پر جمع کرے گا اور تمام لوگ نظریں آسمان کی طرف اُٹھائے فیصلہ کے امر کے منتظر ہوں گے اور اللہ تعالی بادلوں کے سائے میں عرش سے کرسی کی طرف(کیفیشاء) نزول فرمائے گا ابن جریر اور دیگر علماء نے عبد اللہ ابن عمرؓ سے اس آیت کے بارے تخریج کرتے ہوئے فرمایا کہ جب بھی وہ نزول فرمائے گا تو اس(اللہ تعالی) اور اس کی مخلوق کے درمیان نور، ظلمت اور پانی کے ستر ہزار پردے ہوں گے اس عظمت کے عالم میں پانی ایسی آواز پیدا کرے گا جس سے دل دہل جائیں گے۔ابن عباس سے روایت ہے کہ بادلوں کے سائے میں اللہ تعالی فرشتوں کے جھرمٹ میں آئے گا۔"

علامہ اشرف علی تھانوی اپنے ترجمے کے حاشیے میں لکھتے ہیں :

"اللہ تعالی کے لیے آنا وغیرہ جہاں مذکور ہے اس کی تفتیش حقیقت کے درپے ہو جانا جائز نہیں ہے کیونکہ جس طرح ان کی ذات کی حقیقت کسی کو مدرک نہیں ہوتی اسی طرح صفات و افعال کی کُنہ معلوم نہیں ہو سکی البتہ وجود اور وقوع پر اجمالاً بلا تعیین کیفیت ایمان لے آنا چاہیے۔ کہ اس سے زیادہ کی فکر میں پڑنا مالا یطاق کا قصد کرنا ہے۔"(۲۵)

مولانا اشرف علی تھانوی کے اقتباس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ موصوف نے ترجمہ کرتے ہوئے علمائے سلف کے مؤقف کو اپنایا ہے۔

خلاصۂ بحث اور تجاویز

۱۔ قرآن میں غور و تدبر ایک مطلوب اور پسندیدہ عمل ہے۔

۲۔ ترجمۂ قرآن کی بہترین صورت یہ ہے کہ ترسیل معنیٰ کو بھی اہمیت دی جائے اور الفاظِ قرآن کی بھی پابندی کی جائے۔

۳۔ ترجمۂ قرآن کریم پر کلامی رجحان کا بھی اثر ہوتا ہے۔

۴۔ ترجمۂ قرآن کے عمل میں آیات کے کلامی پہلوؤں کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے۔ بصورتِ دیگر ترجمہ مقام الوہیت اور مقام نبوت رسالت کے منافی ہو گا۔

۵۔ ترجمہ میں اس حد تک قوسین کے استعمال سے گریز کیا جائے کہ " عبارت "ترجمہ سے زیادہ" تفسیری حاشیہ" محسوس ہو۔

حوالہ جات

۱۔ صالحہ، عبد الحکیم شرف الدین، ڈاکٹر، قرآن حکیم کے اردو تراجم، قدیمی کتب خانہ، کراچی، ۱۹۸۱ء، ص ۱۷۵

۲۔ الذہبی، محمد حسین، التفسیر والمفسرون، مکتبۃ وہبۃ، قاہرہ، ۲۰۰۰ء، ج ۱، ص ۲۳۔۲۴

۳۔ قاسمی، محمد سعود عالم، ترجمۂ قرآن کے اسالیب اور مشکلات، شش ماہی علوم القرآن، علی گڑھ، ج ۱۸، ش ۲، ص ۴۳

۴۔ البقرہ:۳۵

۵۔ قرطبی، ابو عبد اللہ محمد بن احمد، الجامع لاحکام القرآن، بدار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۷۲ھ، الجزء الاول، ص ۳۰۹

۶۔ مودودی، سید ابو الاعلی، مولانا، تفہیم القرآن، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۸۲ء، ج ۱، ص ۶۶

۷۔ البقرہ:۱۱۵

۸۔ تفتازانی، سعد الدین، علامہ، شرح العقائد النسفیہ، ص ۳۲ تا ۴۳

۹۔ قرطبی، ابو عبد اللہ محمد بن احمد، الجامع لاحکام القرآن، الجزء الثانی، ص ۸۴

۱۰۔ البقرہ:۱۲۳

۱۱۔ مراد آبادی، سید نعیم الدین، خزائن العرفان، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰، ص ۳۴

۱۲۔ دیوبندی، محمود الحسن، ترجمہ قرآن مع موضح الفرقان، دارالتصنیف، کراچی، ۱۹۷۵ء، ص ۱۰

۱۳۔ قرطبی، ابو عبداللہ محمد بن احمد، الجامع لاحکام القرآن، الجزء الاول، ص ۳۷۹

۱۴۔ تفتازانی، سعد الدین، علامہ، شرح العقائد النسفیہ، ملتان، مکتبہ امدادیہ، ۱۹۹۸ء، ص ۱۱۵

۱۵۔ ایضا، ص ۱۱۶

۱۶۔ البقرہ:۴۸

۱۷۔ البقرہ:۲۵۴

۱۸۔ البقرہ:۱۴۳

۱۹۔ قرطبی، ابو عبداللہ محمد بن احمد، الجامع لاحکام القرآن، الجزء الثانی، ص ۱۵۶

۲۰۔ ایضاً

۲۱۔ دیوبندی، محمود الحسن، ترجمہ قرآن مع موضح الفرقان، ص ۲۸

۲۲۔ البقرہ:۲۱۰

۲۳۔ الازہری، پیر محمد کرم شاہ، ضیاء القرآن، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء، ج ۱، ص ۱۴۲

۲۴۔ آلوسی ،ابوالفضل محمود، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، دار احیاء التراث العربی، بیروت، الجزء الثانی، س۔ن، ص ۹۸

۲۵۔ تھانوی، اشرف علی، بیان القرآن، مکتبہ الحسن، لاہور، ۱۴۰۵ھ، ج ۱، ص ۱۱۴